حکیم سید محمود احمد برکاتی

سرسید

ایک مورخ کی حیثیت سے

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ — ۱۸۹۸ء) ۱۹ ویں صدی کی ایک اہم شخصیت تھے۔ وہ ایک سیاسی وسماجی مدبر و قائد بھی تھے اور ادیب و مصنف بھی، اور ان دونوں جہتوں سے مسلسل موضوع بحث و گفتگو بھی رہے ہیں۔ ان کی بیشتر تحریروں کے موضوعات دینی یا سیاسی یا تاریخی ہیں۔ ان کے رسائل کی زیادہ تعداد تاریخ و سیرت سے متعلق ہے، ان کی سب سے پہلی اور سب سے آخری کتابیں بھی تاریخ و سیرت ہی کے موضوع پر ہیں۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ ان کا رجحان تاریخ کی طرف زیادہ تھا۔

ان کے تاریخی رسائل و کتب کی ترتیب و تفصیل یہ ہے :-

۱۔ جام جم (۱۸۳۹ء)
۲۔ جلاء القلوب (۱۸۴۳ء)
۳۔ آثار الصنادید (۱۸۴۷ء)
۴۔ سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲ء)
۵۔ تاریخ بجنور (۱۸۵۶ء)
۶۔ آئین اکبری (تدوین) (۱۸۵۶ء)
۷۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور (۱۸۵۹ء)
۸۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (۱۸۶۱ء)
۹۔ تاریخ فیروز شاہی (تدوین) (۱۸۶۲ء)
۱۰۔ تزک جہانگیری (تدوین) (۱۸۶۳-۴ء)
۱۱۔ الخطبات الاحمدیہ (۱۸۷۲ء)
۱۲۔ قدیم نظام دیہی ہندوستان (۱۸۷۸ء)
۱۳۔ سیرت فریدیہ (۱۸۹۶ء)

ذیل میں ان میں سے چند کا جائزہ اور مطالعہ کیا گیا ہے۔ کہ وہ تاریخ نویسی اور قدیم کتب تاریخ کی تصحیح و تدوین میں کس حد تک کامیاب رہے اور اس طرح ان کا مورخانہ مقام کیا متعین ہوتا ہے؟

آثار الصنادید | سرسید کی تاریخی تصانیف میں اس کتاب کو خصوصیت حاصل ہے۔ اس کتاب کے ایک حصے (باب چہارم) میں ایک سو بیس خاص خاص حضرت دہلی کے سوانح ہیں اور ایک حصے میں دہلی اور اس کے اطراف کی تقریباً دو سو عمارات کا بیان ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری بار مصنف ہی نے اسے

باب چہارم[1] حذف کرکے ۱۸۵۴ء میں شائع کیا تھا۔ تیسری بار ۱۸۷۶ء میں نولکشور پریس سے اور چوتھی بار ۱۹۰۴ء میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی۔ پھر ۱۹۶۵ء میں (مقالات سرسید کے ۱۶ویں حصے کے طور پر) لاہور سے ۱۹۶۵ء میں دہلی سے اور ۱۹۶۶ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ کراچی کا ایڈیشن نامور محقق ڈاکٹر سید معین الحق نے مرتب کیا ہے۔ اور اپنے محققانہ حواشی میں داد تحقیق دی ہے۔

آثار الصنادید کی تالیف میں سرسید نے سخت مشاقت برداشت کی۔ زر کثیر صرف کیا اور عمارات کے کتبے پڑھنے میں پر خطر ذرائع کے استعمال تک میں باک نہیں کیا۔ بحیثیت مجموعی دہلی کے آثار قدیمہ پر یہ ایک قابل قدر کتاب ہے۔

آثار میں سرسید نے بعض عمارات کی بنا و تعمیر کو غلط منسوب کر دیا ہے اور بعض دوسرے تسامح ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند کی نشان دہی مقصود ہے۔

۱۔ عمارات ہزار ستون، سلطان محمد بن تغلق (ف ۷۵۲ھ/ ۱۳۵۱ء) نے اپنے اختیارات کردہ لقب عادل کی مناسبت سے عادل آباد کے نام سے جو شہر بسایا تھا۔ اس میں محلات شاہی کو ہزار ستون کہا جاتا ہے۔ اس عمارت کے متعلق سرسید کا بیان ہے کہ[2]

"ہزار ستون سنگ خارا کے اس میں لگے ہوئے تھے۔"

مگر ابن بطوطہ جو محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی آیا تھا اس کے ستونوں کو لکڑی کے بتاتا ہے[3]

"اس کی بنا لکڑی کے ستونوں پر زمین سے بلندی پر رکھی۔"

۲۔ ست پلہ۔ سرسید نے اس کو سلطان فیروز شاہ کی تعمیر لکھا ہے[4]

مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں دو مقامات پر اسے محمد بن تغلق کی تعمیر لکھا ہے۔ فان شا کی بھی یہی تحقیق ہے۔[5]

۳۔ نیلا برج۔ سرسید نے اس کے بانی اور عہد بنا سے لاعلمی ظاہر کی ہے[6]

یہ فہیم خان کا مقبرہ ہے جو خان خاناں عبدالرحیم خان کے عزیز اور ندیم تھے اور خان خاناں نے ۱۶۲۴ء میں بنوایا تھا۔[7]

۴۔ مسجد قلعہ۔ سرسید نے اس کی تعمیر ہمایوں سے منسوب کی ہے حالانکہ یہ شیر شاہ نے ۱۵۴۱ء میں بنوائی تھی۔[8]

[1] باب چہارم "تذکرہ اہل دہلی" کے نام سے قاضی احمد میاں اختر نے ۱۹۵۵ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کیا تھا۔ مقالات سرسید میں بھی صرف یہی باب شائع کیا گیا ہے۔ عمارات دہلی کا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ [2] آثار الصنادید مدونہ ڈاکٹر معین الحق کراچی ۱۹۶۶ء ص ۱۵۔ [3] ص ۸۶ سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم مدونہ خان صاحب محمد حسین ایم اے لاہور ۱۸۹۸ء [4] آثار طبع کراچی ص ۲۲ [5] ص ۲۸۷ دہلی پاسٹ اینڈ پریزینٹ لندن ۱۹۰۲ء، ڈاکٹر سید معین الحق [6] ص ۳۲ آثار [7] ڈاکٹر سید معین الحق ص ۳۲ [8] ڈاکٹر سید معین الحق ص ۵۹۔

۵۔ کابلی دروازہ۔ سرسید نے اس کے عہد بنا سے لاعلمی ظاہر کی ہے، ڈاکٹر سید معین الحق لکھتے ہیں[۱]

"اس کی تعمیر غالباً شیر شاہ کے ابتدائی دور ۱۵۴۰ء میں ہوئی"

۶۔ مسجد قوت الاسلام۔ سرسید نے اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ رائے پتھورا کے بنا کردہ مندر کو توڑ کر سلطان معز الدین محمد بن سام نے اس بت خانے کی جگہ یہ مسجد تعمیر کرائی تھی[۲]

مگر ڈاکٹر سید معین الحق نے اس کی تردید کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:-

"دور جدید کے اکثر مورخوں نے قرون وسطیٰ کی تصانیف کے بیانات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا اور ان کے الفاظ کے ظاہری معنی لئے ہیں جس سے بہت سے گمراہ کن نتائج اخذ کرنے میں ان کی سہولت ہوتی ہے"

ان کا بیان ہے کہ اس مسجد کی تعمیر قطب الدین ایبک (۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) نے کروائی اور شمس الدین التمش ۶۳۳ھ/ نے اس کی توسیع کی اور اس موقعہ پر کسی مندر یا شکستہ عمارت کا ملبہ استعمال کرنے کی شہادت نہیں ملتی" (ص۵)

۷۔ حوض خاص۔ سرسید نے اس کا بانی فیروز شاہ کو لکھا ہے (ص ۱۰۹) مگر ڈاکٹر سید معین الحق نے ظفرنامہ تیموری کے حوالے سے لکھا ہے۔ کہ یہ علاء الدین خلجی (۱۳۱۹ء) نے بنوایا تھا اور اسی نے ابتداء میں یہ حوض علائی کہلاتا تھا۔ امیر تیمور نے دہلی پر حملے کے وقت اسی حوض کے کنارے اپنا کیمپ قائم کیا تھا۔ فیروز شاہ نے اس کی مرمت کرائی تھی۔ (ص۱۰۹)

سفرنامہ ابن بطوطہ کے مترجم و محشی مولوی محمد حسین نے سرسید کا تعاقب کیا ہے[۳]

"یہ غلطی سید صاحب کو کتبے سے واقع ہوئی ہے لیکن فتوحات فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ نے فقط اس حوض کو صاف کر کے اس کی مرمت کرائی تھی۔ یہ حوض دراصل سلطان علاء الدین خلجی کا بنایا ہوا ہے"

۸۔ موٹھ کی مسجد کے بانی کے متعلق سرسید نے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ ڈاکٹر سید معین الحق نے خلاصۃ التواریخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ مسجد سکندر لودھی کے درباری طبیب میاں بہوہ خان بن خواص خان نے بنوائی تھی ص۱۱۱

۹۔ نہر فیض۔ اس کے متعلق سرسید نے لکھا ہے کہ یہ نہر فیروز شاہ کے سالار رجب نے بنوائی تھی (ص۱۵۷) مگر درحقیقت یہ فیروز شاہ خلجی نے ۱۲۹۰ء میں بنوا کر دی تھی۔ (ڈاکٹر سید معین الحق)

تزک جہانگیری | اس کتاب میں جہانگیر نے ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۳۱ھ تک کے حالات خود اپنے قلم سے لکھے اور بعد کے سالوں کے اپنے درباری معتمد خان سے لکھوائے ہیں

---

[۱] ڈاکٹر سید معین الحق ص۶ [۲] آثار ص۶۶ [۳] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم ص۴۷ [۴] معلوم نہیں کیوں۔ ڈاکٹر محمود حسین خان اور ڈاکٹر سید معین الحق جیسے فضلا نے سرسید کی تاریخ پر اپنے مقالات میں تزک جہانگیری کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ فہرست تصانیف تک میں اس کتاب کا نام نہیں دیا۔

سرسید نے یہ کتاب ۱۸۶۴ء میں مدون کر کے شائع کی تھی۔ سرورق پہ اردو میں لکھا ہے: ۔

"بہ تصحیح نیاز مند درگاہ سید احمد بقالب طبع درآمد"

انگریزی میں ہے۔ ایڈیٹیڈ بائی سید احمد پرنٹڈ ایٹ مسز پرائیویٹ پریس ۱۸۶۴ء اے ڈی ۱۲۸۱ ایچ

ابتدا میں ۱۲ صفحات کا مقدمہ ہے اس کے بعد پھر ایک سرورق ہے اس پہ انگریزی میں ہے۔

ایڈیٹیڈ بائی سید احمد خان غازی پور، پرنٹڈ ایٹ مسز پرائیویٹ پریس ۱۸۶۳ اے ڈی/ ۱۲۸۰ ایچ

تصحیح وتدوین کسی کتاب کے متعدد مخطوطات کو سامنے رکھ کر ایک صحیح نسخے کی ترتیب کا نام ہے، متن کے بیانات کے صواب وخطا کی ذمہ داری مدون پر نہیں ہوتی۔ اور مدون کا فرض سمجھا جاتا ہے کہ چاہے مصنف و ماتن کے بیانات اس کے عقائد سے متصادم ہی کیوں نہ ہوں اور چاہے عبارت بھی صرفی نحوی اغلاط ہی کیوں نہ ہوں ان کو جوں کا توں من وعن کسی کے حک واضافہ حتیٰ کہ اعراب کی تصحیح کے بغیر نقل کر دے۔ مدون کو یہ حق اور اختیار ضرور حاصل ہوتا ہے کہ وہ حواشی میں مصنف کے بیان کی تصحیح و تعلیط کر دے۔ لیکن یہ بات تصحیح وتدوین کے اصول و روایات کے قطعاً خلاف ہے کہ وہ مصنف کی کسی عبارت کو گمراہ کن، خلاف عقائد یا خلاف عقل یا زبان و بیان کے لحاظ سے غلط قرار دے کر حذف یا تبدیل کر دے۔

سرسید کی تزک جہانگیری بھی دو ایسے مقامات علم ونظر میں آتے ہیں جہاں انہوں نے مصنف کی عبارت کو کتاب سے حذف اور خارج کر دیا ہے۔

۱۔ ابوالفضل کے قتل کا جہاں ذکر ہے وہاں جہانگیر نے ابوالفضل پہ جو فرد جرم لگائی ہے اس میں یہ جملہ بھی تھا: ۔

"در پیرانہ سالی پدرم را از راہ مستقیم باز داشت"

مگر سرسید کی مدونہ تزک جہانگیری میں یہ جملہ نہیں ہے۔ مولانا نسیم احمد فریدی لکھتے ہیں کہ میں نے ایک مخطوطہ تزک (مدرسہ اشاعت العلوم بریلی) میں یہ عبارت دیکھی تھی[1]

جہانگیر کا یہ جملہ فرد جرم کی نوعیت ایک دوسری شکل میں پیش کرتا ہے اور یہ تاثر ہوتا ہے کہ ابوالفضل سے جہانگیر کو عداوت صرف ذاتی بنیادوں پہ نہیں تھی بلکہ وہ اس کے افکار و آرا کو راہ مستقیم سے منحرف کرتا اور اسے اپنے والد کے گمراہ کن سمجھتا تھا۔ اور یہ جملہ خارج ہونے کے بعد ابوالفضل کے قتل کا محرک جہانگیر کی اس سے ذاتی رنجش محسوس ہوتی ہے

۲۔ جہانگیر کو ایک بار ۱۰۱۶ھ میں سات بنگالی بازی گروں اور شعبدہ بازوں نے اپنے ہنر دکھائے تھے اور جہانگیر اور اس کے درباریوں نے دو رات دن مسلسل بیٹھ کر یہ تماشا دیکھا تھا اور اپنی تزک میں حیرت کے ساتھ

---

[1] صد۵ الفرقان (افادات گیلانی نمبر جولائی ۱۹۵۷) لکھنؤ

اس کا تذکرہ کیا تھا۔

مگر سرسید نے تزک سے یہ مقام حذف کر دیا۔

ابن بطوطہ نے چین میں ایسے ہی حیرت ناک کرتب دیکھے تھے اور اپنے سفرنامے میں ان کا ذکر کیا تھا۔ مولوی محمد حسین نے سفرنامے کے ترجمے کے دوران اپنے حواشی میں تائید کے طور پر جہانگیر کا یہ بیان نقل کرنا چاہا جو انہوں نے تزک جہانگیری میں دیکھا تھا۔ مگر ان کو اس وقت تزک کا وہ ایڈیشن دست یاب ہوا جو سرسید نے شائع کیا تھا۔ اور اس میں یہ واقعہ انہیں نہیں ملا۔ اس لئے انہوں نے طبا طبائی کی سیر المتاخرین (جلد اول صد ۲۴۳) سے دربار جہانگیر کا یہ واقعہ نقل کیا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

مجھے تزک جہانگیری کا جو نسخہ ملا وہ اتفاقاً علی گڑھ کا چھپا ہوا تھا۔ اس لئے یہ عبارت میں نے سیر المتاخرین سے ترجمہ کی ہے۔ تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڑھ کے نسخے میں یہ مقام سید احمد خان نے نکال ڈالا ہے۔

اس کے بعد مولوی محمد حسین سرسید کے اس فعل کے متعلق اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے۔

"کسی غیر کی کتاب میں یہ تصرف ہر طرح سے مذموم ہے ایڈیٹر یا محشی یا نقل کرنے والے اس قدر کر سکتے ہیں جیسا کہ سیر المتاخرین کے مصنف نے یہ تماشے نقل کرکے لکھ دیا ہے کہ فقیر از کتابے کہ انتساخ نمودہ چنین نوشتہ اند اگرچہ معقول نیست والعہدت علی الراوی"

پھر اس کے بعد اس کی توجیہہ کرتے ہیں:۔

غالباً سید صاحب مرحوم کو اس بے جا تصرف پر اس بات نے آمادہ کیا ہوگا کہ بازی گروں کے ایسے تماشے دکھانا ان (سرسید) کی کرامات اور معجزات کے انکار کو ضعف پہنچانا ہے کیوں کہ تماشے کا راوی خود جہانگیر بادشاہ تھا جس کی عادت مبالغہ کرنے کی نہیں ہے۔ اور اس کی قوت مشاہدہ بھی مسلم تھی اور تماشے کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا بتلاتا تھا۔" صد ۲۲۲

ہماری رائے میں مولوی محمد حسین نے توجیہہ صحیح کی ہے اور سرسید کی اس کمزوری کی صحیح نشاندہی کی ہے جس نے ان کو بے جا تصرف پر آمادہ کیا۔

آخر میں سرسید کے ایک حاشیے کا ذکر بھی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ جو انہوں نے تزک کی ایک عبارت پر لکھا ہے۔ جہانگیر نے تزک میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے اس کو چار مرقعے پیش کئے جو پستے کے چھلکے کے برابر یا تھی دانت کے تھے۔ ان میں سے چوتھے مرقعے میں ایک درخت کے نیچے حضرت عیسیٰؑ کو بیٹھا دکھایا تھا۔ (تزک صد ۹۷)

اس پر سرسید نے حاشیہ لکھا کہ:۔

غالباً ایں کارنامہ از کارنامہ ہائے کاری گران فرنگ بودہ و بدستش افتادہ آں را از نام کارنامۂ خود گزرانید

غالباً یہ کسی یورپین صناع کا کارنامہ تھا جو اس شخص کے ہاتھ لگ گیا۔ اور اس نے جہانگیر کو اپنے نام سے پیش کر دیا۔

اور دلیل یہ دی ہے کہ ایک مسلمان کی حضرت عیسیٰؑ کی تصویر بنانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

اس پر مولانا شبلی نے تعاقب کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"سید صاحب کو اس کا یقین نہیں آسکتا کہ کوئی ہندوستانی شخص بھی ایسا کمال دکھا سکتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ کسی یورپین نے بنائی ہوگی۔ اور اس پر قرینہ یہ قائم کرتے ہیں کہ چوتھے مرقع میں حضرت عیسیٰؑ کی تصویر ہے۔ خوش اعتقادی کی یہ اخیر حد ہے۔" سلسلۃ الملوک

سرسید نے ۱۸۵۲ء میں دہلی کے پانچ ہزار سالہ فرماں رواؤں کا ایک جدول (چارٹ) سلسلۃ الملوک کے نام سے شائع کیا تھا اور اس کو آثار الصنادید کی اشاعت ثانیہ کے آغاز میں شامل کر دیا تھا۔ جو ۱۸۵۲ء میں طبع ہو گئی تھی مگر ۱۸۵۴ء میں شائع ہو سکی۔

اس جدول میں دہلی کے دو سو دو راجاؤں اور بادشاہوں کے نام اور دوسری تفاصیل ہیں۔ آغاز سے ۱۸۵۲ء تک کے ہر فرماں روا کے لئے ایک خانہ مخصوص کیا گیا ہے۔ جب اس جدول کے آخری حصے پر نظر ڈالتے ہیں اور ۱۹۹ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ اور ۲۰۲ نمبر کے خانوں کو پڑھتے ہیں تو ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔

دہلی کے آخری شاہوں کے خانے یوں تبدیل ہونا چاہیئے تھے۔

شاہ عالم ثانی جلوس ۱۷۵۹ء وفات ۱۸۰۶ء۔ اکبر شاہ ثانی جلوس ۱۸۰۶ء وفات ۱۸۳۷ء

بہادر شاہ ثانی جلوس ۱۸۳۷ء

مگر ان کے بجائے یہاں شاہان انگلستان خانہ نشین نظر آتے ہیں۔

شاہ جارج دوم فتح دہلی ۱۸۰۳ء انتقال ۱۸۲۰ء۔ شاہ جارج چہارم جلوس ۱۸۲۰ء انتقال ۱۸۳۰ء

شاہ ولیم چہارم جلوس ۱۸۳۰ء انتقال ۱۸۳۷ء۔ ملکہ وکٹوریہ جلوس ۱۸۳۷ء

پہلے تو یہ سوچتے ہیں کہ انہی سرسید نے اس سے ۱۳ سال پہلے ۱۸۳۹ء میں اسی قسم کا ایک جدول (جام جم) شائع کیا تھا جس میں دہلی کے صرف مسلم فرماں رواؤں کے نام تھے (امیر تیمور سے بہادر شاہ ثانی تک) اس وقت بھی تو لارڈ دہلی کو "فتح" کر چکا تھا۔ مگر اس میں شاہ عالم ثانی بھی تھے، اکبر شاہ ثانی بھی اور بہادر شاہ ثانی بھی۔ پھر آخر ۱۳ سال میں حالات میں ایسا کون سا انقلاب آگیا کہ یہ حضرات بادشاہ نہیں رہے اور شاہان انگلستان فرماں روا ہو گئے؟

پھر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ جب اکبر شاہ ثانی دہلی کے فرماں روا نہیں رہے تھے تو سرسید کے نانا کس کے وزیر اعظم تھے اور انہیں نواب دبیر الدولہ امین الملک بہادر مصلح جنگ وغیرہ خطابات کس نے اور کس حیثیت سے

دیتے تھے۔ اور ان دبیر الدولہ نے وہ سکّے کس کے نام سے ڈھالے تھے جو بقول آپ کے غدر تک رائج رہے۔ جب اکبر شاہ ثانی، فرماں روا نہیں رہے تھے؟ ان کے نام کے سکّے کیوں مروج تھے؟[1]

سرسید کے نانا کے خاص دوست اختر لونی (آکٹرلونی) کو نصیر الدولہ فخر الملک وفادار خان بہادر ظفر جنگ کے خطابات کس نے دئے تھے؟ اور یہ اختر لونی کے عہدے ریذیڈنٹ کا کیا مطلب تھا؟ اور یہ ریذیڈنٹ کس کی طرف سے اور کس کے دربار میں تھے؟ اور دربار عام کے موقعوں پر ان کے سامنے کھڑے کیوں رہتے تھے؟ بیٹھ کیوں نہیں جاتے تھے۔ اور نذریں کیوں پیش کرتے تھے؟

خود سرسید کو جو رد الدولہ عارف جنگ کا خطاب بہادر شاہ نے کس حیثیت سے دیا تھا؟ اور اس خطاب کو ۱۸۵۲ء میں ہی ہیں، اور ۱۸۵۷ء میں ہی نہیں ۱۸۹۶ء تک کیوں، بڑے فخر اور اہتمام سے استعمال کرتے رہے؟ بہادر شاہ ثانی جب فرماں روا نہیں رہے تھے۔ بلکہ تخت نشین ہی نہیں ہوئے تھے۔ تو ان کے نام کا سکہ کیوں رائج ہوا تھا جس کا شعر آپ نے جام جم میں درج کیا ہے؟

ان سوالات کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ صورت حال بالکل مختلف تھی۔

اصل میں، اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ مگر برعظیم کے باحمیت باشندے اس کو سقوط دہلی کہتے ہیں "فتح دہلی" بعض مواقع پر بعض حقائق صرف نظر ہی معیار شرافت اور تقاضائے حمیت ہوتا ہے تو قومی و ملّی نقطۂ نظر سے یہ سقوط دہلی تھا۔ دہلی پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ یہ اہل وطن کے لئے کوئی گوارا اور قبول خاطر خبر نہیں تھی۔ ایک ناگوار حقیقت اور بار گوش خبر تھی۔ اس لئے ساکنان حضرت دہلی، خواہ ناخواہ حکم کمپنی بہادر کا مانتے تھے۔ مگر مرکز عقیدت لال قلعہ تھا، تخت طاؤس تھا، "بادشاہ سلامت" تھا۔

جہاں تک قانون کا تعلق ہے، اس کی رو سے بھی حکومت لال قلعے کے مکینوں ہی کی تھی چاہے اس میں انگریزوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی مصلحت ہی کیوں نہ ہو مگر وہ بھی قانوناً بادشاہ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ثانی ہی کو کہتے تھے۔ سکہ الٰہی کے نام کا ڈھالا جاتا اور چلتا تھا۔ ریذیڈنٹ ان کے دربار میں بیٹھ کر نہیں لکھتا تھا، کھڑا رہتا تھا

---

[1] واضح رہے کہ سرسید نے اپنے انتقال سے صرف ۲ سال پہلے ۱۸۹۶ء میں اپنے نانا خواجہ فرید الدین کی سوانح سیرت فریدیہ کے نام سے شائع کی تھی۔ اس کے سرورق پر خواجہ کے لئے یہ پورے خطابات تحریر کئے تھے اور اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم بنائے جانے کے واقع کو ان کی زندگی کے سب سے اہم اور نمایاں واقعے کے طور پر لکھا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ شاہ کے سامنے دربار میں ہر درباری کو کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ مگر شاہ نے خواجہ کو ایک جریب (چھڑی) عطا کی تھی تاکہ اس کے سہارے کھڑے رہیں۔ اختر لونی کو بھی چھڑی عطا ہوئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا جو شاہوں کی جانب سے رعایا کے کسی فرد کو عطا ہوتا تھا۔ سرسید نے اس پر افتخار کا اظہار کیا ہے

اور بادشاہ تخت طاؤس پر بیٹھتا تھا۔

مختصر یہ کہ ۱۸۵۲ء میں مغل فرماں رواؤں کی جگہ لندن کے شاہوں کو دہلی کا بادشاہ ظاہر کرنا، نہ اظہار حقیقت تھا نہ اہل وطن کے جذبات کی ترجمانی تھی نہ اس کی بظاہر کوئی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ نہ ایسا نہ کرنے سے انگریز کے ناخوش ہونے کا اندیشہ تھا۔

"سن ستاون" کے انقلاب سے ۵/۶ سال پہلے شاہان دہلی کو اس طرح "معزول" کر کے شاہان انگلستان کو دہلی پر "مسلط" کر دینا سرسید کا کوئی اضطراری اقدام نہیں تھا جو بے ارادہ اٹھ گیا ہو۔ یا جس پر انہیں ندامت ہو۔ یہ ان کا ایک سوچا سمجھا اقدام تھا جس پر انہیں ندامت نہیں فخر تھا۔ وہ اس کا اخفا نہیں چاہتے تھے، اعلان کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:-

"۱۸۵۴ء میں جب میں نے ایک تاریخ دہلی کی پرانی اور اگلی عمارتوں کی لکھی تو سلسلہ سلطنت مغلیہ ۱۸۰۳ء سے یعنی جب سے لارڈ لیک سپہ سالار سلطنت انگلشیہ نے دہلی کو فتح کیا، منقطع میں اور ہندوستان کی سلطنت سلسلہ شاہان انگلستان کا قائم کیا۔ اس سے یقین ہو سکتا ہے کہ اس ہنگامے (سن ستاون) سے پہلے میری نیت یہی تھی کہ تمام اہل ہندوستان جان لیں کہ اب سلطنت خاندان مغلیہ کی ختم ہو گئی اور ہندوستان کی بادشاہت شاہان انگلستان کی ہے۔ اس لئے تمام "رعایا" کو اپنے بادشاہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کی خیر خواہی اور اس سے محبت کرنی چاہیئے۔"[۱]

سرسید نے اپنے ان افکار و نظریات کی بنا پر خود کو ان عام اہل وطن سے کاٹ لیا تھا، جو ۵/۶ سال اور ۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ انگریز کے وفاداروں میں شامل ہو گئے تھے اور ان کی حسرتیں، دعائیں اور اعانتیں کمپنی کے لئے تھیں۔ مگر یہ ایک مستقل موضوع گفتگو ہے اور ہم سیرت فریدیہ کے مقدمے میں اس پر تفصیل سے اظہار خیال کر چکے ہیں۔ اس وقت اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ ایسا کر کے انہوں نے تاریخ نویس کی حیثیت سے اپنے فرائض سے نظر کیا۔ اور اپنے سیاسی عزائم اور عقائد کا بے موقع ابلاغ کیا ہے۔ حقیقت پسندی اور دیانت داری کے بجائے اپنی خواہشوں کو انہوں نے حقیقت فرض کر لیں۔ اور دوسروں سے اس کو منوانا چاہا تھا۔

سیرت فریدیہ | سرسید کی یہ آخری تالیف ہے جو پہلی مرتبہ مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۶ء میں طبع ہوئی۔ پھر ایک بار اور شائع ہوئی اور تیسری بار خاکسار نے اس پر حواشی اور طویل مقدمہ لکھ کر ۱۹۶۴ء میں شائع کیا (پاک اکیڈمی کراچی)۔ اس مقدمے میں ہم سیرت فریدیہ پر "ایک حیات" اور "سیرت" کی حیثیت سے تفصیلی اظہار خیال کر چکے ہیں۔ اس لئے اس وقت اختصار کے ساتھ اس کے کم اور پہلوؤں کی نشاندہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

---

[۱] لائل محمڈنز آف انڈیا، مطبوعہ مفصلائٹ پریس آگرہ

سرسید نے یہ کتاب اپنے نانا خواجہ فریدالدین کی سوانح کے طور پر لکھی تھی جو اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم رہے تھے اور جنہیں شاہ نے دبیرالدولہ امین الملک مصلح جنگ کا خطاب دیا تھا اور سرسید نے یہ خطاب بشمول سرورق پوری کتاب میں استعمال کیا ہے اور ۱۸۹۶ء میں کیا ہے۔

اس کتاب پر ایک کی حیثیت سے جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک غیر معیاری اور ناقص و نامکمل سوانح ہے۔ اردو میں اس سے پہلے حالی و شبلی کی حیات سعدی اور المامون شائع ہو چکی تھیں۔ ان سے اس کتاب کا موازنہ کرنے پر مایوسی ہوتی ہے۔

صاحب سوانح کی تعلیم کا بیان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ۳۵ سال کی عمر میں ریاضی کی تعلیم کے لئے ان کے لکھنؤ جانے کے ذکر پر سرسید نے یہ باب ختم کر دیا ہے۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ اس عمر تک انہوں نے کن کن علوم کی تحصیل کی تھی کن کن اساتذہ سے فیض حاصل کیا تھا۔ ریاضی کی تحصیل کے لئے دہلی کے فضلاء ریاضی کو چھوڑ کر لکھنؤ جانے کے کیا اسباب تھے؟

خواجہ کے حلقۂ احباب کی کوئی جھلک قاری کو نہیں دکھائی۔ حالاں کہ کسی شخص کے مقام کے تعین اور مذاق کے تعارف کے لئے اس کے حلقۂ احباب سے متعارف کرانا ضروری ہوتا ہے۔ وہ کس معیار کا آدمی تھا؟ کس قسم کے افراد میں اس کی آمد و رفت اور نشست و برخاست تھی۔

اولاد و اعقاب کا تذکرہ بڑا ناقص ہے۔ خواجہ کی وفات ۱۸۲۸ء میں ہوئی تھی۔ حالاں کہ یہ وہ وقت ہے کہ جب خواجہ کے نواسے (سرسید) کے پوتے (راس مسعود) ہوشیار ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ خواجہ کے بیٹوں کے پوتے بھی صاحب اولاد ہوں گے۔ مگر ان کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

خواجہ کے لئے لکھا ہے کہ وہ سات سو روپے ماہوار پر مدرسہ کلکتہ کے سپرنٹنڈنٹ رہے تھے۔ اولاً تو ۱۸۳۹ء میں جام جم میں سرسید نے خواجہ کو مدرسہ کا نختیس مدرس (مدرس اول) لکھا ہے (صفحہ ۲۰) اور اس کتاب میں سپرنٹنڈنٹ لکھ رہے ہیں؟ ان دونوں اقوال میں تطبیق کی ضرورت ہے۔ ثانیاً مدرسہ کلکتہ کی (جسے مدرسہ عالیہ بھی کہا جاتا ہے) ایک مبسوط تاریخ مولوی عبدالستار نے لکھی ہے۔ اس کی رو سے نہ صرف اس سن میں بلکہ کسی بھی زمانے میں مدرسے میں سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ نہیں رہا۔ اور پھر خواجہ فریدالدین نامی کوئی بزرگ اس مدرسے کے کسی بھی عہدے پر نظر نہیں آتے۔ اس کے علاوہ سات سو روپے ماہانہ تنخواہ اس دور میں اس مدرسے میں کبھی بھی نہیں رہی ویسے بھی اس دور میں ملک کی تنخواہوں کے معیار سے یہ گراں قدر مشاہرہ مطابقت نہیں رکھتا۔